ہندوستان کی شرعی حیثیت

(از ـــــ سعید احمد اکبر آبادی)

ـــــــ (۲) ـــــــ

اس کے برخلاف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جو باعتبارِ تفقہ اپنے تمام معاصرین میں امتیازِ خاص رکھتے تھے۔ ان کو دیکھیے۔ آپ نے امداد الفتاویٰ میں متعدد مقامات پر ہندوستان میں سود لینے کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے لیکن ہندوستان کو کہیں دار الحرب نہیں لکھا۔ بلکہ آپ کا یہ ارشاد عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ریل کا ٹکٹ نہیں خرید سکا اور اسی حالت میں اُس نے سفر بخیر وخوبی طے کرلیا تو اب اُسے چاہیے کہ اتنی ہی مسافت اور اسی درجہ کا ایک ٹکٹ خرید کر چاک کردے۔ تاکہ گورنمنٹ کا نقصان نہ ہو۔

ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ہم نے یہاں تک صرف اکابر علمائے احناف کے ارشادات وبیانات پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جماعت اہلِ حدیث کے علما بھی بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارہ میں ان علمائے اعلام کی آرا، اس لئے اور بھی لائقِ توجہ ہیں کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت سید احمد شہید کے زیرِ قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اور اسی بنا پر انگریز انھیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے۔ بہرحال اس جماعت کے علما میں مولانا ابو سعید محمد حسین لاہوری (جو عام طور پر بٹالوی بھی مشہور ہیں) بلند پایہ عالم اور صاحبِ تصنیف وقلم بزرگ تھے۔ لاہور سے اشاعۃ السنۃ نامی ایک دینی پرچہ شائع ہوتا تھا۔

مولانا اُس کے اڈیٹر اور زمانہ کے اعتبار سے سرسید احمد خان۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے ہمعصر تھے۔ موصوف نے ۱۸۷۶ء میں ایک رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے لکھا تھا جو انھیں دنوں میں وکٹوریہ پریس میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا نے بڑی قوت اور زور سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان ہرگز دارالحرب نہیں ہے اور اس بنا پر انگریزوں کے خلاف جہاد جائز نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"جو مخالفینِ اسلام کسی کے مذہب سے تعرض کرنا جائز نہ سمجھیں اور اس امر کو خواہ بمقتضائے مداہنت خواہ بہ ہدایت مذہب خواہ بحکمِ عقل و اصولِ سلطنت بہت بُرا سمجھیں۔ جیسا کہ برٹش گورنمنٹ کا حال و چال ہے۔ ان سے مذہبی جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں" [1]

یہ تو ہوئی جہاد کی بات! اب ملک کی شرعی حیثیت کے بارہ میں سُنیے۔ فرماتے ہیں:

"جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہو وہ شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو۔ اقوامِ غیر نے اس پر تغلب سے تسلط پالیا ہو (جیسا کہ ملک ہندوستان ہے) تو جب تک اُس میں ادائے شعائرِ اسلام کی آزادی رہے وہ بحکمِ حالتِ قدیم دارالاسلام کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ قدیم سے اقوامِ غیر کے قبضہ و تسلط میں ہو۔ مسلمانوں کو انہی لوگوں کی طرف سے ادائے شعائرِ مذہبی کی آزادی ملی ہو تو وہ بھی دارالاسلام اور کم سے کم دارالسلم و الامان کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق ہے۔" [2]

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مولانا محمد حسین صاحب نے جو کچھ اس رسالہ میں لکھا ہے وہ اس میں منفرد نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ رسالہ کے شروع میں (صفحہ ۳ و ۴) خود انھوں نے لکھا ہے یہ رسالہ انھوں نے ۱۸۷۶ء میں لکھ لیا تھا۔ لیکن اُس کو شائع کرنے سے قبل انھوں نے علمائے اسلام کی رائیں لینے کی غرض سے لاہور سے عظیم آباد پٹنہ تک کا سفر کیا اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"اور اکابر علمائے مختلف فرقہائے اسلام کو یہ رسالہ حرف بحرف سنا کر ان کا توافقِ رائے حاصل کیا اور بعض بلادِ ہندوستان و پنجاب میں جہاں راقم خود نہیں جا سکا۔ اس رسالہ

---

[1] الاقتصاد فی مسائل الاجتہاد ص ۱۸۔ [2] ایضاً ص ۱۹۔

کی متعدد کاپیاں بھجوا کر ان بلاد کے اکابر علما کا اتفاق رائے حاصل کیا "

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کس پایہ کے عالم تھے ؟ اُن کی تصنیفات اور ترجمۂ قرآن سے ظاہر ہے، اُن کے نزدیک بھی ہندوستان دارالحرب نہیں تھا بلکہ اگر کسی وقت انگریزوں نے مسلمانوں کے سفرِ حج پر کوئی پابندی مذہبی تعصب کے بغیر کسی عام مصلحت سے لگائی تھی تو وہ ہرگز مداخلت فی الدین نہیں تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

" دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جس میں کافروں کی عملداری ہو اور وہاں کا حاکم مذہبی ضد سے مسلمانوں کو فرائض اسلامی نماز روزہ حج زکوٰۃ کے بجالانے سے روکے اور منع کرے۔ ایسے ملک میں مسلمانوں کو رہنا درست نہیں..... خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ہندوستان باوجودیکہ نصاریٰ کی عملداری ہے دارالحرب نہیں ہے اس لئے کہ یہاں بجا آوریِ فرائض میں کسی طرح کی روک ٹوک نہیں۔ اور جو طاعون کی وجہ سے حاجیوں کو سفرِ حجاز سے روکا جاتا ہے تو یہ روکنا حکماً نہیں بلکہ عارضی اور صلاح و مشورہ کے طور پر ہے۔ اور اس سے زیادہ روک ٹوک تو مصر اور روم میں جاری ہے جہاں اسلامی حکومت ہے۔ کہ مرضِ طاعون متعدی ہے ایک سے اُڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے۔ موسم حج میں لوگوں کا بہت سا اژدہام ہوگا تو خوف ہے کہ کہیں مری نہ پھیل جائے۔ پس اگر اس کو روک ٹوک سمجھا بھی جائے تو نہ اس لئے ہے کہ لوگ فریضۂ حج نہ ادا کریں۔ بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے ہے کہ حاجیوں کی جانیں ضائع نہ ہوں "[1]

آزاد ہندوستان اور اُس کا حکم

یہاں تک انگریزوں کے زمانہ کے ہندوستان کا تذکرہ تھا۔ اب ہمیں موجودہ آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت پر بحث کرنی چاہیے۔ کیوں کہ مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری نے خود اس باب میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :" حضرت شاہ صاحب (مولانا کشمیری) نے اپنی اس تحریر میں

[1] ترجمۂ قرآن حاشیۂ سورۂ نساء رکوع ۱۴۔

سب سے پہلے کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کی اصل بنیاد بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔
بایدد انست کہ مدار بودن بلدۂ وملکے دارالاسلام یا دارالحرب بر غلبۂ مسلمانان وکفارست وبس"
پھر اس اصول کو دلائل وشواہد اور حوالوں سے مستند و موثق فرمایا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔
" این اصل را خوب ذہن نشین باید کرد۔ کہ جملہ مسائل ازہمین اصل برمی آیند وہمہ جزئیات این باب و اثر برہمین اصل ہستند" اس کے بعد اسی اصل پر تفریعات ہیں اور مختلف جزئیات و مسائل بیان فرمائے ہیں اور بعض شبہات کا ازالہ کیا ہے اور آخر میں ہندوستان کی صورتِ حال بتلاکر اس ملک کے دارالحرب ہونے کا حکم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔ بہرحال تسلطِ کفار برہند بدان درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار رابر دارالحرب زیادہ نبود۔ وادائے مراسمِ اسلام از مسلمانان محض باجازتِ ایشان است و از مسلمانان عاجزترین رعایا کسے نیست" یہ سب کچھ لکھنے لکھانے کے بعد مولانا منت اللہ صاحب غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :۔

"ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے جبکہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا۔ اس تحریر میں دارالحرب کے لئے جو اصل و بنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جاسکتی ہے" (ص ۲)

وہ فیصلہ کن رائے کیا ہے؟ مولانا نے اگرچہ اُس کو گول مول رکھا ہے لیکن اس طرح کہ

غیر پھرتا ہے لئے یُوں ترے خط کو کہ اگر　　کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے (غالب)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک موجودہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ پھر امیرِ شریعت بہار اس میں منفرد نہیں ہیں بلکہ سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند مولانا محمد میاں کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ ایک تحریر جو بصورتِ افتا ہے اُس میں فرماتے ہیں :۔

" یہ ملک (جنوبی افریقہ) یقیناً دارالحرب ہے۔ کیونکہ مسلمان دوسرے اقتدار کے ماتحت ہیں، خود ان کی حکومت نہیں ہے۔ نہ اُن کا کوئی ایسا با اختیار شرعی نظام یا کوئی ایسا نواب یا امیرِ شریعت ہے جس کو حکومت نے مسلمانوں کے معاملات کا اختیار دے رکھا ہو۔

ایسا ملک اصطلاحِ شریعت میں دارالحرب کہلاتا ہے" اس کے بعد بعض کتبِ فقہ سے دو ایک عبارتیں نقل کی ہیں، اور پھر لکھتے ہیں:

"اگر آپ دار کا ترجمہ اسٹیٹ (ریاست) کرلیں تو دارالاسلام اور دارالحرب کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ غیر مسلم اسٹیٹ کو دارالحرب کہا جاتا ہے اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن و حفاظت کا کوئی معاہدہ ہو، یا اس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے تحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ مسلم اسٹیٹ نہیں ہے تو دارالاسلام نہیں ہے بہرحال فقہ کی اصطلاح میں اس کو دارالحرب کہا جاتا ہے" (روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۶۶ء ص ۴ کالم ۱)

مولانا محمد میاں کی یہ تحریر اگرچہ جنوبی افریقہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے۔ لیکن مذکورۂ بالا عبارت میں آپ نے دارالحرب کی جو تعریف کی اور اُس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ ہندوستان کا حکم بھی آپ کے نزدیک وہی ہے جو جنوبی افریقہ کا ہے۔ یعنی وہ بھی دارالحرب ہے اور ہندوستان بھی دارالحرب!

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند | جنوبی افریقہ کی ریاست کے بارہ میں ایک سوالنامہ دارالعلوم دیوبند میں بھی موصول ہوا تھا۔ یہاں کے دارالافتاء کی طرف سے اُس کا جو جواب گیا ہے اور جس پر مولوی محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی اور مفتی محمود احمد الصدیقی دونوں کے دستخط ہیں اور تاریخ یکم شعبان ۱۳۸۶ھ درج ہے۔ اُس میں بھی کم و بیش وہی بات کہی گئی ہے جو مولانا محمد میاں نے کہی ہے۔ اور اُس سے بھی استنباط یہی ہوتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ "آپ کی (یعنی سائل کی) تحریر کے مطابق جمہوریۂ افریقیہ میں مسلمان اقل قلیل ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ جمہوریہ میں غلبہ و تسلط غیر مسلموں کا ہے اور یہی مدار ہے دارالحرب ہونے کا"[1]

دارالحرب سے متعلق اوپر جو اقتباسات و بیانات نقل کئے گئے ہیں اُن کو بیک نظر دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی ملک کے دارالحرب ہونے کا دارومدار اس ملک میں غیر مسلموں کی اکثریت اور ان کے استیلا و تسلط پر ہے۔ لیکن معاملہ فی نفسہٖ اس قدر آسان نہیں ہے کہ دو چار عبارتیں

[1] ماہنامہ الرحیم پاکستان بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۶۸۔

فقہاء کی نقل کرکے اور اُس پر دو تین جملے لکھ کر ختم کر دیا جائے۔ اس بنا پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث و گفتگو کریں گے اور اس سلسلہ میں پہلے یہ دیکھیں گے کہ (۱) فقہاء کے نزدیک دارالحرب کی کیا تعریف ہے۔ اُس کی کیا پہچان اور کیا خصوصیات ہیں؟ (۲) دار کی قسمیں کتنی ہیں؟ اور ان اقسام میں باہم کیا نسبت ہے؟ اس کے بعد اس پر غور کریں گے کہ موجودہ زمانہ میں جبکہ قومیت اور وطنیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا ہے اور دنیا کی تمام مسلم اور غیر مسلم حکومتیں قومی اور بین الاقوامی معاملات میں اسی جدید تصور پر ملکی دساتیر حکومت میں عمل پیرا ہو رہی ہیں، اسلامی تعلیمات و احکام کی روسے ان ممالک کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو ہندوستان کے دستور اور اس کے نظام حکومت کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا کہ آزاد ہندوستان مسلمانوں کے لئے شرعی طور پر کس قسم کا دار ہے اور مسلم ممالک کے لئے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

دارالحرب کی تعریف اور اس کی خصوصیات

کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہا کے ذہن میں دارالحرب دو قسم کے تھے۔ ایک وہ ملک جو شروع سے دارالحرب بنے چلے آرہے ہیں، اور ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اور دوسرے وہ ممالک جن کے حالات بدلتے سدلتے رہے ہیں، یعنی کبھی اُن پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور کبھی غیر مسلموں کا۔ اور جیسا کہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ محمد بن محمود الاشتروسنی نے لکھا ہے۔ دراصل یہ دوسرے قسم کے ہی ممالک ہیں جو اُس زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہونچ گئے تھے۔ جن کے باعث فقہا کو دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کرکے انکی حد بندی کرنی پڑی[1]

---

[1] کتاب الفصول ق ۱ ورق ۲ مخطوطہ دارالعلوم دیوبند۔ مصنف جن کا انتقال ۶۳۲ھ میں ہوا ہے۔ ماوراء النہر کے اکابر مجتہدین و فقہا میں سے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جو بڑی پایہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا تذکرہ کشف الظنون ص ۸۴ میں ہے، اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے الفوائد البہیہ۔ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ میں صفحہ ۸۲ و ۸۳ پر بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

ہندوستان اگر دارالحرب ہے تو ظاہر ہے پہلی قسم کا تو ہرگز ہو ہی نہیں سکتا، لامحالہ دوسری قسم کا ہی ہوگا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ فقہا کے نزدیک اس دارالحرب کی کیا تعریف اور اُس کی کیا خصوصیات ہیں:

امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا اختلاف

اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ امام ابویوسف اور امام محمد کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی ملک پر مشرکین کا قبضہ ہوجائے اور وہ اُس میں احکام شرک ظاہر کرنے لگیں تو وہ ملک دارالحرب بن جاتا ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اس پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ آپ کے نزدیک کسی ملک کے دارالحرب بن جانے کے لئے اُس میں تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ امام صاحب اور صاحبین کی یہ رائے فقہ حنفی کی سب ہی مشہور کتابوں میں مذکور ہے۔ ہم صرف مبسوط للسرخسی سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں:

والحاصل ان عند ابی حنیفۃ انما تصیر دارھم دار الحرب بثلاث شرائط احدھا ان تکون متاخمۃ ارض الترک لیس بینھا وبین ارض الحرب دارٌ للمسلمین الثانی ان لا یبقی فیھا مسلمٌ اٰمنٌ بامانہ ولا ذمی اٰمنٌ بامانہ۔ الثالث ان یظھروا احکام الشرک فیھا وعن ابی یوسف ومحمد اذا اظھروا احکام الشرک فیھا فقد صارت دارھم دار حرب۔ [1]	غرض کہ ابوحنیفہ کے نزدیک غیر مسلموں کا ملک تین شرطوں سے دارالحرب بنتا ہے (۱) ایک یہ کہ یہ ملک تاتاریوں (اُس وقت تک یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے ملک سے ملا ہوا ہو یعنی اس ملک اور ارض حرب میں مسلمانوں کا کوئی ملک نہ ہو۔ (۲) دوسری یہ کہ اس میں کوئی مسلمان سابق امان کے ساتھ نہ ہو اور اسی طرح کوئی ذمی سابق امان کے ساتھ نہ ہو (۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ لوگ شرک کے احکام ظاہر کریں، اس کے برخلاف ابویوسف اور محمد کے نزدیک احکام شرک کے ظاہر کرتے ہی یہ ملک دارالحرب بن جاتا ہے۔

---

[1] المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۱۱۴ باب المرتدین۔

اس عبارت اور اسی جیسی دوسری عبارتوں سے یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ صاحبین کے نزدیک محض احکامِ شرک کے اظہار سے ملک دارالحرب بن جاتا ہے اور اس کے برخلاف امام ابوحنیفہ کی رائے میں کوئی ملک اُس وقت تک دارالحرب نہیں ہو سکتا جب تک اُس میں شرائطِ سہ گانہ اک ساتھ نہ پائی جائیں اس بنا پر یہ اختلاف حقیقی ہے اور چونکہ امام صاحب کے شرائطِ سہ گانہ میں خود صاحبین کی شرط داخل ہے اس لیے ان دونوں مسلکوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ یعنی جو ملک امام صاحب کے مسلک پہ دارالحرب ہوگا وہ صاحبین کے مسلک پر بھی ہوگا۔ لیکن جو ملک صاحبین کے نزدیک دارالحرب ہو ضروری نہیں ہے کہ امام صاحب کے نزدیک بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اختلاف حقیقی نہیں بلکہ صرف نزاعِ لفظی ہے، کیونکہ صاحبین محض اظہارِ احکامِ شرک کو جو دارالحرب ہونے کی بنیاد قرار دیتے ہیں تو یہ مطلق نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر شخص کو مذہب کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان میں بھی تھی، اور اس حد تک تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر ایسے متقشف اور متصلب فی الدین فرمانروا کے خزانۂ شاہی سے مندروں کے لئے باقاعدہ گھی اور تیل مہیا کیا جاتا تھا اور مندروں کے پجاریوں اور پنڈتوں کے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے۔ چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین سے عالمگیر کے ایسے چالیس فرمان دستیاب ہوئے تھے جن میں وہاں کے مہنتوں اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ پس جب احکامِ شرک کا ظہور اسلامی حکومت کے ماتحت دارالاسلام میں بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے تو احکامِ شرک کا مطلقاً اظہار دارالحرب ہونے کی بنیاد کیونکر قرار پا سکتا ہے؟ اس بنا پہ لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اظہارِ احکامِ شرک سے صاحبین کی مراد اہلِ شرک کا قہر و غلبہ اور ایسا استیلا و استبداد ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شعائر پر قائم رہنے اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ رہے اور وہ اس معاملہ میں مقہور و مغلوب ہو جائیں۔ امام صاحب نے 'اظہارِ احکامِ شرک' جو اُن میں اور صاحبین میں مشترک شرط ہے۔ اس کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں وہ درحقیقت اسی استیلا، یا قہر و غلبۂ اہلِ شرک کی علامتیں ہیں نہ کہ مستقل کوئی دو جداگانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اُسی ایک چیز کی توضیح اور تشریح ہے۔

جسے صاحبین نے صرف ایک جملہ میں بیان کردیا ہے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اسی فتوے زیرِ بحث میں فرماتے ہیں :

الحاصل این اصلِ کلی و قاعدۂ کلیہ است کہ دارالحرب مقہور کفار است و دارالاسلام مقہور اہلِ اسلام اگرچہ در یک دار دیگر فریق ہم موجود باشد بلا غلبہ و قہر و آن جا کہ قہر ہر دو فریق باشد آن ہم دارالاسلام خواہد بود[1]	خلاصہ یہ ہے کہ قاعدۂ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ دارالحرب وہ ہے جو مقہورِ کفار ہو اور دارالاسلام وہ ہے جو مقہورِ اہلِ اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار میں دوسرے دار کے لوگ بھی بدون غلبہ و قہر کے آباد ہوں اور جس ملک پر دونوں فریق کا تسلط ہو وہ بھی دارالاسلام ہی سمجھا جائے گا۔

اس عبارت سے نتیجہ یہ نکلا کہ ملک تین قسم کے ہیں :-

(الف) جس پر غیر مسلموں کا ایسا قبضہ ہو کہ مسلمانوں کو اُس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ب) جس پر مسلمانوں کا ایسا قبضہ ہو کہ غیر مسلموں کو اُس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ج) جس پر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اقتدار اور تسلط حاصل ہو۔

ان تینوں میں پہلا ملک دارالحرب ہوگا اور باقی دونوں دارالاسلام کہلائیں گے۔

استیلاء تام کی حقیقت پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ دارالحرب ہونے کا دارومدار غیر مسلموں کے استیلائے تام اور ان کے بے شرکتِ غیرے غلبہ و قہر پر ہے تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ فقہا کے نزدیک اس استیلا اور غلبہ و قہر کا تحقق کب ہوتا ہے ؟ اور اس کا معیار کیا ہے ؟

فقہا نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اُس کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ استیلا صرف اُس صورت میں متحقق ہوتا ہے جب کہ ملک کے نظم و نسق میں مسلمانوں کو کوئی کسی قسم کا عمل دخل نہ ہو اور ان کو مذہبی آزادی بھی حاصل نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو نظم و نسق میں دخل ہے۔ یا دخل تو نہیں ہے لیکن مذہبی آزادی بہرحال حاصل ہے۔ ان دونوں صورتوں میں "استیلاء" متحقق نہیں ہوگا۔

---

[1] فیصلۃ الاعلام فی دارالحرب و دارالاسلام ص ۴ و ۵۔

اور اس بنا پر وہ ملک شریعت کی اصطلاح میں دارالحرب نہیں کہلائے گا۔

اب ہم فقہا کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جن سے ہم نے استیلا کے مفہوم اور حقیقت کی تعیین و تشخیص میں یہ جو کچھ کہا ہے اُس کی تائید ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے :

ان الامان ان کان للمسلمین فیھا	اگر ملک میں مسلمانوں کو مطلق امان اور
علی الاطلاق والخوف للکفرۃ علی الاطلاق	کفار کو مطلق خوف ہو تو وہ دارالاسلام
فھی دارالاسلام وان کان الامان فیھا	ہے اور اگر اس کے برعکس مکمل امان کفار کو
للکفرۃ علی الاطلاق والخوف للمسلمین	ہو اور مطلق خوف مسلمانوں کو تو وہ
علی الاطلاق فھی دارالکفر۔[1]	دارالحرب ہے۔

یہ صورت ہوئی استیلائے تام کی۔ اب لیجئے وہ دو صورتیں جن سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ تو ان میں سے پہلی یہ ہے کہ نظم و نسق میں دخل ہو' اس سلسلہ میں ردالمحتار میں ہے :

لو اجریت احکام المسلمین	اگر مسلمانوں اور اہلِ شرک دونوں کے احکام
واحکام اھل الشرک لا تکون	جاری ہیں (یعنی وہاں کی حکومت مشترکہ ہے) تو
دارحرب۔[2]	وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ مذکورۂ بالا عبارت میں صرف حکومت یا اقتدار میں شرکت کا ذکر ہے اس چیز کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ شرکت کس درجہ کی ہے۔ اس بنا پر اگر کسی ملک میں اقتدارِ اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو تب بھی وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا!

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جو جنگِ آزادی میں جمعیۃ علما کے سب سے بڑے سپہ سالار اور میرِ کارواں تھے اس وسوسہ یا شبہ سے کیونکر خالی الذہن ہو سکتے تھے؟ چنانچہ آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوی پر کلام کرتے ہوئے صاف لفظوں میں تحریر فرمایا کہ :-

"اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو

---

[1] جلد ۷ ص ۱۳۱۔ [2] جلد ۳ ص ۲۷۵۔

لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔"[1]

اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ مسلمان نظم و نسقِ مملکت میں کوئی عمل دخل تو نہ رکھتے ہوں لیکن اُن کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو ایسے ملک کے دارالحرب نہ ہونے کا اولین ماخذ ہجرتِ حبشہ ہے۔ جو نبوت کے پانچویں برس وقوع پذیر ہوئی تھی۔ یہاں مسلمان مہاجرین و مہاجرات کو جو امن و امان اور آرام و اطمینان ملا صحابۂ کرام نے اُس پر تشکر کا اظہار اس طرح کیا کہ اُنھیں دنوں میں نجاشی کے ملک پر کسی دشمن نے حملہ کیا اور خود نجاشی اُس کے لئے میدان میں اُترا تو ان صحابہ نے نجاشی کی فتح کے لئے دعا کی اور جنگ کے لئے خود اپنی خدمات پیش کیں۔[2] اس کے علاوہ ایک دوسرا ماخذ یہ ہے کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ہمیں کسی قبیلہ سے جنگ کرنے کے لئے بھیجتے تھے تو ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ اگر تمھیں اس قبیلہ میں کوئی مسجد نظر آئے یا وہاں سے اذان کی آواز سنائی دے تو اُس پر حملہ نہ کرنا۔[3]

ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قبیلہ کے ساتھ غزوہ کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے ہیں اُس کی عظیم اکثریت غیر مسلموں پر ہی مشتمل ہوگی۔ پھر اگر اس آبادی سے اذان کی آواز آتی یا وہاں کوئی مسجد نظر آتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اکا دکا مسلمان بھی آباد ہیں اور انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ محض اس بنا پر حضورؐ کا اس قبیلہ کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا حکم دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان تعداد میں کتنے ہی کم سہی، لیکن اگر ان کو مذہبی آزادی حاصل ہے تو اب یہ علاقہ "دارالحرب" نہیں رہا، ان دونوں ماخذوں کا اطلاق اُن علاقوں پر ہوتا ہے جو اب تک دارالاسلام نہیں بنے ہیں، لیکن جو علاقہ ایک مرتبہ دارالاسلام بن چکا ہے اُس کے دارالحرب نہ بننے کے ثبوت میں فقہا نے ان دو ماخذوں کے علاوہ دو دلیلیں اور پیش

---

[1] نقشِ حیات ج ۲ ص ۱۱۔ [2] سیرت النبی، مولانا شبلی ج ۱ ص ۲۴۰۔ [3] مسند امام احمد بن حنبل ترتیب ساعاتی ج ۱۴ ص ۵۹۔ یہ روایت بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی سند کے اختلاف کے ساتھ ہے۔

کی ہیں، ایک یہ کہ جس حکم کا وجود کسی علت پر مبنی ہوتا ہے تو جب تک وہ علت بالکلیہ مرتفع نہیں ہو جائے گی۔ حکم مرتفع نہیں ہوگا۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ الاسلام یعلو و لا یعلی۔ اس بنا پر جس ملک میں بھی اسلامی زندگی کے تھوڑے بہت آثار و علائم موجود ہیں وہ دارالحرب نہیں ہو سکتا؛

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کو ذہن میں رکھ کر اب آپ خود فقہا کی زبان سے اُن کے بیانات سنیے:-

سرخسی فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک ملک جو دارالاسلام رہ چکا ہے وہ دارالحرب اُس وقت بنتا ہے جبکہ وہاں مشرکین کو مکمل قہر اور غلبہ ہو۔ اور مکمل قہر اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون نہ ہو۔ اصل الفاظ یہ ہیں:-

ان بقی فیھا مسلمٌ او ذمی آمنٌ	اگر اس ملک میں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون
فذالک دلیل عدم تمام	(بامانِ سابق) ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ مشرکوں
القھر منھم۔[1]	کو اس ملک میں مکمل قہر و غلبہ حاصل نہیں ہے۔

صاحبِ درمختار ملتقی الابحر کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولا تصیر دار الاسلام دار الحرب	اور کوئی دارالاسلام اُس وقت تک دارالحرب
الا بامورٍ ثلاثۃ: باجراءِ	نہیں بن سکتا جب تک کہ اُس میں تین چیزیں اکٹھا
احکامِ الشرک۔ وباتصالھا	نہ پائی جائیں (۱) وہاں احکامِ شرک جاری ہوں۔
بدار الحرب وبان لا یبقی فیھا مسلمٌ	(۲) وہ دارالحرب سے متصل ہو (۳) اور اُس
او ذمی بالامان الاول۔[2]	میں ایک مسلمان اور ذمی بھی امانِ سابق سے نہ رہتا ہو۔

محمد بن محمود الاشروسنی لکھتے ہیں:

وابو حنیفۃ یقول: ان ھذہ البلدۃ	اور ابوحنیفہ فرماتے ہیں "یہ ملک احکامِ اسلام کے
صارت دار الاسلام باجراءِ احکام	جاری ہونے سے دارالاسلام ہو گیا تھا تو اب جبتک
الاسلام فیھا فما بقی شیءٌ من احکام الاسلام	اس میں اسلام کا کوئی ایک حکم بھی موجود ہے، وہ

[1] المبسوط للسرخسی باب المرتدین ج ۱۰ ص ۱۱۴۔ [2] الدر المنتقی فی شرح الملتقی مخطوطہ دار العلوم دیوبند ۲۵۵

فیها یبقی دار الاسلام علی ما عرف ان الحکم اذا ثبت بعلة فما بقی شیٔ من احکام العلة یبقی الحکم ببقائه [1]

دارالاسلام ہی رہے گا۔ کیوں کہ یہ معلوم ہے کہ جب کوئی حکم ثابت ہوجاتا ہے تو جب تک علت کا کچھ حصہ بھی باقی رہتا ہے اُس کی بقاء سے حکم بھی باقی رہتا ہے۔

اس کے بعد شرح سیر الاصل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابوبکر رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے۔

علاوہ ازیں شیخ الاسلام نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ:

ان دار الاسلام لا یصیر دار الحرب اذا بقی شیٔ من احکام الاسلام وان زال غلبة اهل الاسلام

دارالاسلام اُس وقت تک دارالحرب نہیں ہوسکتا جب تک اُس میں اسلامی احکام میں سے کچھ بھی باقی ہو۔ اگرچہ اہلِ اسلام کا غلبہ نہ رہا ہو۔

پھر صدر الاسلام ابوالیسر کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ:

ان دار الاسلام لا یصیر دار الحرب ما لم یبطل جمیع ما به صارت دار الاسلام۔

دارالاسلام اُس وقت تک دارالحرب نہیں ہوسکتا جب تک وہ سب چیزیں فنا نہ ہوجائیں جن کے باعث وہ ملک دارالاسلام بنا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

وذکر شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ فی مبسوطه ان دار الاسلام محکومة بکونها دار الاسلام فیبقی هذا الحکم ببقاء حکم واحد فیها وذکر الامام اللامشی فی واقعاته انما صارت دار الاسلام بهذه الاعلام الثلاثة

اور شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ نے اپنی مبسوط میں بیان کیا ہے کہ جب دارالاسلام پر دارالاسلام ہونے کا حکم لگ گیا تو اب اگر ایک اسلامی حکم بھی باقی رہے گا تو یہ دارالاسلام ہونے کا حکم بھی باقی رہے گا۔ اور امام لامشی نے اپنے واقعات میں بیان کیا ہے کہ ایک ملک جب تینوں علامتوں کے باعث

---

[1] کتاب الفصول ج ۱ ورق ۲ مخطوطہ دارالعلوم دیوبند۔

فلا تصیر دار الحرب ما بقی شیء منها۔ وذکر الشهید الامام الاجل ناصر الدین فی المنشور ان دار الاسلام صارت دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فما بقیت علقة من علائق الاسلام ترجح جانب الاسلام وذکر فی الملتقط ان البلاد التی فی ایدی الکفار لا شک انها بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانها غیر متاخمة لبلاد الحرب ولانهم لم یظهروا فیها احکام الکفر۔ [1]

دارالاسلام ہوگیا تو اب جب تک ان علامتوں کا ایک شمہ بھی باقی ہے یہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا۔ اور شہید امام اجل ناصر الدین نے منشور میں لکھا ہے کہ ایک ملک جو احکامِ اسلام کے اجراء سے دارالاسلام بن گیا ہے تو جب تک کسی قسم کا بھی لگاؤ اس کو اسلام سے رہے گا جانبِ اسلام کو ہی ترجیح رہے گی۔ اور انہوں نے ملتقط میں بیان کیا ہے کہ جو علاقے کفار کے قبضہ میں ہیں وہ بے شبہ اسلامی علاقے ہیں نہ کہ حربی۔ کیوں کہ یہ علاقے بلادِ حرب سے متصل نہیں ہیں اور پھر ان علاقوں کے حکمرانوں نے ان میں احکامِ کفر کو غالب نہیں کیا ہے۔

مذکورۂ بالا عبارتوں میں آپ نے ملاحظہ فرمایا فقہائے کرام برابر یہ کہتے جارہے ہیں کہ اگر اسلام کا ایک حکم بھی باقی ہوگا تو ملک دارالحرب نہیں ہوگا، اب یہ بھی سن لیجئے کہ یہ ایک حکم جس کا بقاء عدمِ اظہارِ کفر کی دلیل ہے فقہا کے نزدیک اُس کا معیار اور اُس کی حد کیا ہے؟ یہی محمد بن محمود الحنفی الاشتروسنی فرماتے ہیں:

یجوز فیه اقامة الجمعة والاعیاد وتزویج الایامی۔ [2]

اس ملک میں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا اور بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا جائز ہو۔

اسی سلسلہ میں فتاوی بزازیہ میں ہے:

واما البلاد التی علیها ولاة کفار فیجوز فیها ایضاً اقامة الجمع والاعیاد

اور جن علاقوں پر حاکم کفار ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا

---

[1] کتاب الفصول ۱۶ ورق ۲ ۔ [2] ایضاً۔

والقاضی قاض بتراضی المسلمین وقد تقرران ببقاء شئ من العلة یبقی الحکم وقد حکمنا بلاخلاف فان ھذہ الدیار قبل استیلاء الکفار کان من دیار الاسلام وبعد استیلاء ھم اعلان الاذان والجمع والجماعات والحکم بمقتضی الشرع والفتوی والتدریس شائع بلا نکیر من ملوکھم فالحکم بانھا من دار الحرب لاجھة لہ نظراً الی الدراسة والدرایة۔ واعلان بیع الخمور واخذ الضرائب والمکوس والحکم من انتقض برسم التتار کاعلان بنی قریظة بالیھودیة وطلب الحکم من الطاغوت فی مقابلة محمد صلے اللہ علیہ وسلم فی عھدہ بالمدینة ومع ذالك کانت بلدة اسلام بلاریب[1]

گوارا ہے اور خود مسلمانوں کی آپس کی رضامندی سے وہاں قاضی بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ علت کے ایک جز کے بقا سے حکم باقی رہتا ہے اور ہم نے بلاخلاف کے یہ حکم کیا تھا کہ کفار کے استیلا سے پہلے یہ علاقے دارالاسلام تھے اور ان کے استیلا کے بعد اذان دینا۔ جمعہ اور جماعت اور شریعت کے مطابق حکم دینا۔ فتویٰ دینا اور درس دینا عام طور پر مروج ہے اور کفار کے بادشاہوں کی طرف سے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ اس بنا پر ان علاقوں کو دارالحرب کہنے کی کوئی وجہ نہ عقلی ہے اور نہ نقلی اور شراب کا کھلم کھلا بیچنا اور خراج لینا اور ٹیکس وصول کرنا اور تاتاریوں کی رسم کا توڑنا ان سب کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ بنو قریظہ کا اعلانِ یہودیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں طاغوت سے حکم کا طلب کرنا حضورؐ کے عہدِ مدنی میں۔ اور بلاشبہ ان سب چیزوں کے باوجود مدینہ بلاشبہ اسلام کا شہر تھا۔

فقہائے کرام کی ان تمام تصریحات کو سامنے رکھنے سے جو نتیجہ بلاکسی دغدغہ اور خدشہ کے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ صرف وہ ملک دارالحرب ہوگا جہاں کفر کا غلبہ اور استیلا بایں معنی ہو کہ نہ تو مسلمان اُس کی

---

[1] بحوالہ اردو ترجمہ مجموعۃ الفتاوی مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی جلد اول ص ۱۲۴۔

حکومت اور نظم و نسق میں شریک ہوں اور نہ اُن کو مذہبی آزادی حاصل ہو، یعنی یہ دونوں چیزیں استیلاء وغلبہ کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اس بنا پر یہ دونوں نہ ہوں یا ان میں سے ایک نہ ہو بہرحال قوت الجز قوت الکل کے قاعدہ کے مطابق استیلا متحقق نہیں ہوگا اور اس لئے حسب ذیل دونوں قسم کے ملک دارالحرب نہیں ہوں گے:

(الف) وہ ملک جس میں مسلمان شریکِ حکومت ہیں۔

(ب) وہ ملک جس میں مسلمان شریکِ حکومت تو ہیں نہیں البتہ انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔

احتمالِ عقلی کے طور پر ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان شریکِ حکومت تو ہیں مگر ان کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ لیکن ہم نے اس صورت کا ذکر قصداً اس لئے نہیں کیا ہے کہ اگر واقعی کسی ملک میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مذہبی آزادی کے نہ ہونے کے باوجود حکومت میں شریک ہیں تو وہ سچ مچ اس شعر کا مصداق ہیں:-

اپنے ہاتوں سے جو ڈھا آئیں خدا کے گھر کو ؛ ننگِ اسلام ہے ایسوں کا مسلماں ہونا

اور ظاہر ہے اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملک دارالحرب ہے یا دارالاسلام!

ہندوستان کی دستوری پوزیشن اب آیئے ہندوستان کی دستوری پوزیشن کا جائزہ لیں۔ اس پر غور کرنے سے پہلے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ آزادی کے اس پس منظر کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ ملک کی آزادی کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ ایک عرصہ تک سرگرمِ عمل رہے۔ دونوں نے یکساں قربانیاں دیں، جیل گئے۔ پٹے اور مارے گئے، جمعیۃ علما جو علمائے ہند کی نمائندہ جماعت تھی اُس نے آخر دم تک کانگریس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کانگریس کا نصب العین آزادی کے بعد جمہوری نظام قائم کرنا شروع سے رہا ہے اور علماء اس پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے رہے ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے بعد علمائے کرام کے نزدیک ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہوتی؟ وہ دارالحرب رہتا یا دارالاسلام؟ اگر دارالحرب ہوتا تو کیا علما کے لئے جائز تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کو جو (انگریزوں کے زمانہ میں) دارالحرب نہیں تھا اسے عظیم الشان قربانیاں دے کر دارالحرب بنائیں؟

اور اگر وہ دارالاسلام بنتا تو پھر تقسیم نے ملک میں اکثریت و اقلیت کے اعتبار سے آخر ایسی کونسی بنیادی تبدیلی پیدا کی ہے جس کے باعث ملک اگر تقسیم نہ ہوتا تو دارالاسلام ہوتا اور اب تقسیم ہوگیا ہے تو یہ دارالحرب بن گیا۔ آخر دستوری طور پر وہ کونسی چیز ہے جو تقسیم نہ ہونے کی صورت میں ہوتی اور اب نہیں ہے اور اس بنا پر پہلی صورت میں شرعی حکم کچھ اور ہوتا اور اب کچھ اور ہوگا! صوبائی طور پر آبادی کم و بیش ہوتی لیکن مرکز میں پوزیشن تو بہرحال یہی ہوتی جس کا ذکر مسلم لیگ بار بار کرتی تھی۔

بہرحال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتہ نہ ہوسکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا اور اُس کی بنیاد پر ہی ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی کی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم سے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت۔ دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جن کے پیشِ نظر اغلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظامِ جمہوریت اختیار کیا گیا۔

جمہوریت | اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے۔ مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود یکساں شہری حقوق رکھتا ہے، پیشوں میں، ملازمتوں میں، عہدوں میں غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے مذکورۂ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا، ہر شخص جو بالغ ہے اُس کو رائے دینے کا حق ہوگا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندہ کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔ عام حق رائے دہندگی (ADULT FRANCHISE) کے ذریعہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہوگا۔ اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی، اور اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اُس کی تشکیل میں تمام اہالیانِ ملک کا دخل ہوگا۔ گویا اصل طاقت بلا اختلاف مذہب و ملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

---

(1) THE CONSTITUTION OF INDIA PART III ARTLS 14-16

مذہبی آزادی | اب لیجئے مذہبی آزادی! اس سلسلہ میں دستور اعلان کرتا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (CONSCIENCE) کی آزادی کا حق ہوگا اور ان کو اس بات کا بھی حق ہوگا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب کو چاہیں مانیں، اُس پر عمل کریں اور اُس کی تبلیغ کریں۔

(۲) ہر مذہبی فرقہ یا طبقہ کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی خاطر (الف) ادارے قائم کریں اور چلائیں۔ (ب) مذہبی معاملات میں اُس کا وہ خود انتظام کریں (ج) اُس ادارہ کے لئے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد حاصل کریں۔ (د) اور اُس جائداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں۔[1]

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے نمائندوں کی طرف سے ان کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا "جناب! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو ان کے ساتھ دو قالب و یک جان بنا دے گا۔" ایک اور صاحب نے کہا: "میں اکثریتی فرقہ کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اقلیتی فرقوں کے ساتھ بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے۔"[2]

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقائد و اعمال اور اُس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی۔ بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ "حکومت مذہب کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہوگی اور اسی بنا پر حکومت کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے اُن میں کسی مذہب کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا!"[3]

اقلیتوں کو طبعی طور پر یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے بچے حکومت کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا کر کہیں ارتداد (INDOCTRINATION) کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس دفعہ سے اس اندیشہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

(1) PART III - ARTS 25,26. (2) CONSTITUENT ASSEMBLY DELEATES VOLUME VII PAGES 260 - 267 (3) ARTICLE 2,8

سپریم کورٹ اب سوال یہ ہے کہ دستور نے باشندگانِ ملک کو جو یہ حقوق دیئے ہیں ان کی حفاظت اور نگرانی کون کرے گا۔ اور پھر اگر کسی دفعہ کی یا اُس کے کسی لفظ کی مراد اور اُس کی تشریح میں اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ کون کرے گا ؟ جواب یہ ہے کہ دستور نے یہ سب اختیارات سپریم کورٹ کو دیئے ہیں[1]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اور پارلیمنٹ یہ سب دستور کے وفادار اور اُس کے پابند ہیں اور دستور کی تشریح و توضیح اور ظلم و زیادتی سے اُس کی حفاظت، یہ سب سپریم کورٹ کا حق ہے اور اس بنا پر گورنمنٹ بھی مجبور ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں انڈین سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس آنریبل کوکا سب راؤ (KOKA SUBBA RAO) نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ "سپریم کورٹ کا فرض یہ ہے کہ دستور نے جو بنیادی حقوق دیئے ہیں کورٹ اُن کے اور سماجی انصاف کے درمیان تطبیق و توافق رکھے اور ہیئتِ منتظمہ (حکومت) کو راہ سے بے راہ نہ ہونے دے" اسی بنا پر سپریم کورٹ کے لئے غیر جانبدار اور بے خوف ہونا ضروری ہے"[2]

دستور کا عملی پہلو اب غور کیجئے۔ دستور کی دفعہ جو شہری حقوق سے متعلق ہے وہ مسلمانوں کو حکومت کے کاروبار میں اکثریت کے ساتھ شریک کرتی ہے اور مذہبی آزادی سے متعلق جو دفعہ ہے وہ ان کو مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی شعائر و رسوم کو بجا لانے کی۔ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی۔ مذہبی تعلیم اور دینی امور کو سرانجام دینے کی غرض سے خود اپنے ادارے قائم کرنے اور ان کو حکومت کی مداخلت کے بغیر چلانے کی پوری آزادی دیتی ہے۔ شہری حقوق میں معاشی آزادی بھی شامل ہے اور اس لئے مسلمانوں کو اس بات کی بھی پوری آزادی حاصل ہے کہ حصولِ معاش کے لئے وہ جو پیشہ چاہیں اختیار کریں، ملازمت، صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت۔ ان میں سے ہر ایک کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا ہے اور کسی اعتبار سے کہیں کسی جگہ اکثریت اور اقلیت میں کوئی کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے، چنانچہ جہاں تک حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ صدر جمہوریہ اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں تو نائب صدر ایک مسلمان ہے۔ اسی طرح مرکز اور ریاستوں کی وزارتوں میں۔ سفارتوں میں۔ گورنروں میں

---

(1) ARTICLE 32 (2) DAILY STATESMAN, 28 THE JUNE, 1966 P. 5.

حکومت کے دفاتر میں چھوٹے ہوں یا بڑے۔ پارلیمنٹ میں، اسمبلیوں میں، عدالتوں میں، کارخانوں اور کمپنیوں میں یونیورسٹیوں میں، ہر جگہ مسلمان موجود ہیں، حکومت کی تشکیل میں ان کے ووٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، بلکہ بعض علاقوں میں تو اُن کا ووٹ پاسنگ کی حیثیت رکھتا یعنی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اب رہی مذہبی آزادی! تو اس آزادی کی کونسی قسم ہے جو انھیں حاصل نہیں ہے۔ ملک میں لاکھوں مسجدیں ہیں جہاں سے پانچوں وقت اذان کی آواز بلند ہو کر فضا میں گونجتی ہے۔ بعض بڑے بڑے شہروں کی خاص خاص مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہے اور اُس پر اذان ہوتی ہے، عید بقرعید اور بعض اور مسلم تہواروں کی تعطیل حکومت کے کیلنڈر میں شامل ہے۔ ہر سال حج کے لئے کم و بیش سترہ اٹھارہ ہزار مسلمان حج کو جاتے ہیں اور اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لئے سہولتیں پیدا کرنے کے سلسلہ میں گورنمنٹ وہ سارے کام کرتی ہے جو اسلامی حکومتیں کرتی ہیں۔ حکومت کی مقرر کردہ دو مرکزی حج کمیٹیاں ہیں جدہ میں ہندوستانی سفارت خانہ پورے عملہ کے ساتھ حاجیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت کرتا ہے۔ مکہ اور مدینہ میں اور حج کے دنوں میں منیٰ اور عرفات میں ڈاکٹروں، لیڈی ڈاکٹروں اور دواؤں کا انتظام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف صوبوں سے حجاج کی عام خدمت کے لئے اسکاؤٹس الگ جاتے ہیں، اس سال زرِ مبادلہ کے سخت گھاٹے کے باوجود حکومت نے دو کروڑ روپیہ کا اکسچینج حاجیوں کے لئے منظور کیا، پھر مسلمانوں کی مذہبی اور دینی تعلیم بالکل آزاد ہے ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں مدارسِ عربیہ اور ہزاروں مکاتبِ دینیہ ہیں جو بغیر کسی مداخلت کے اپنا کام کر رہے ہیں، دارالعلوم دیوبند جس کا بجٹ تقسیم سے پہلے اسّی نوے ہزار ہوتا تھا اس سال اُس کا بجٹ دس لاکھ روپیہ کا ہے۔ علاوہ ازیں حیدر آباد کا دائرۃ المعارف جو اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کا سب سے اہم ادارہ ہے وہ اور اس کے علاوہ۔ کلکتہ۔ پٹنہ اور رامپور وغیرہ کے بعض مدارسِ عربیہ تمام تر حکومت کے خرچ اور اُس کے انتظام سے چل رہے ہیں۔ سنسکرت کی طرح عربی اور فارسی کے کسی ایک اسکالر کو بھی ہر سال صدر جمہوریہ کی طرف سے اعزاز ملتا ہے۔ تبلیغی جماعت، اسلامی جماعت اور دینی تعلیمی کونسل سب اپنے اپنے طریقہ پر کام کر رہی ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔

تقریر و تحریر کی آزادی ہمارا دستور اظہار مافی الضمیر کی گارنٹی دیتا ہے۔ تو مسلمان بھی اس سے فائدہ

اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا مسلم پریس جس آزادی اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات و مسائل اور اُن کی شکایات و تکالیف کے بارہ میں لکھتا اور حکومت پر تنقید کرتا ہے۔ بلاشبہ عرب اور افریقہ کے بہت سے مسلم ممالک کے اخبارات یہ جرأت و جسارت نہیں دکھا سکتے۔

معاشی آزادی دستور معاشی آزادی کی جو ضمانت کرتا ہے مسلمان اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ملک میں گھوم پھر کر دیکھئے اللہ کے فضل و کرم سے صنعت و حرفت، تجارت، زراعت و فلاحت ان میں سے کوئی شعبہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہو اور وہ ترقی نہ کر رہے ہوں۔ تقسیم کے بعد بتاشہ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ لیکن اب وہ ایک نئی توانائی اور خود اعتمادی کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔ ان کے اپنے مِل بھی ہیں اور کارخانے بھی۔ بعض خاص خاص صنعتوں کے دائرہ میں اب تک ان کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ ان میں کروڑ پتی بھی ہیں، اور لکھ پتی بھی، چھوٹے دکاندار بھی ہیں اور بڑے بھی! مال درآمد بھی کرتے ہیں اور برآمد بھی! پھر کثرت سے فارم اور باغات والے بھی ہیں جو اپنے ہاں کی خصوصی پیداوار پر گورنمنٹ سے کئی کئی انعام لے چکے ہیں۔

شکایات اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے شکایات بھی ہیں اور بعض بہت شدید قسم کی! لیکن منطق کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہم ایک سالبہ کلیہ بناتے ہیں اور وہ یہ کہ "مسلمانوں کے ساتھ ہرگز کوئی انصاف نہیں ہو رہا ہے" لیکن کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلیہ صحیح ہے پس جب یہ صحیح نہیں تو لامحالہ اس کی نقیض یعنی موجبہ جزئیہ صحیح ہوگی اور اب قضیہ یہ ہوگا کہ "مسلمانوں سے کچھ انصاف ہو رہا ہے اور کچھ نہیں ہو رہا ہے" اب دیکھنا یہ ہے کہ مکمل انصاف اور دستور پر مکمل عمل کس کے حق میں ہو رہا ہے؟ آقا آپ کو معلوم ہے۔ ملک کا کیا حال ہے؟ کونسی بیماری ہے جو ہمارے سماج میں نہیں ہے۔ کونسا آزار ہے جس میں ہمارا معاشرہ مبتلا نہیں۔ روگ کی وہ کونسی قسم ہے جو قوم کے رگ وپے میں ساری نہیں! آدمی پاگل ہوتا ہے تو ماں باپ اور بہن بھائی پر بھی ہاتھ اُٹھا بیٹھتا ہے۔ پس مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اُن کو ملک کے عام حالات کے پس منظر کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ مسلمان ایک کُل کا جُز ہیں۔ جب کُل ہی صحت مند نہیں تو جز صحت مند کیسے ہو سکتا ہے۔ ملک کے مختلف طبقات میں اگر ذات پات کے، زبان کے اور علاقائی حد بندی کے تعصبات پائے جاتے ہیں اور ان کی بنیاد پر آئے دن شکست و ریخت اور حرب و ضرب

کے ہنگامے برپا رہتے ہیں تو اگر مذہب کے نام پر بھی مفسدہ پردازوں کے ایک گروہ نے منمانی کرنے کی ٹھان لی
تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ بہرحال ملک کی عام ناگفتہ بہ اور تباہ کن صورتِ حال کے اصل اسباب حکومت
کی نااہلیت اور کمزوری اور عوام میں جمہوریت کی قدروں کا عدم احساس یہی دو ہیں۔ کم و بیش کا فرق ہے۔ لیکن
مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اُس کے اسباب بھی یہی ہیں، اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمانوں کو جو شکایات ہیں وہ
محض اس لئے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں!! معاشرہ میں جب تک فساد ہے مسلمانوں کو بحیثیت ایک فرقہ کے
کامل اطمینان کبھی نہیں ہو سکتا۔ معاشرہ جب سدھر جائے گا تو مسلمانوں کو بھی اطمینان ہو جائے گا اور مسلمانوں
کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے آپ کو سدھار لیں تو معاشرہ کے سدھارنے میں بھی وہ ایک
بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں دستور نے جو حقوق مسلمانوں کو دیے ہیں ان پر اگر کہیں کوئی زد
پڑتی ہے تو اُس کے خلاف احتجاج کرنا یہ مسلمانوں کا آئینی حق ہے وہ انھیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے بھی ہیں لیکن
ساتھ ہی یہ نہ بھولیے کہ احتجاج کے حق کا آئینی ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اس ملک کے شہری حقوق
میں کسی سے کم نہیں، بلکہ برابر ہیں۔ مغلوب نہیں بلکہ شریک ہیں۔ محکوم نہیں بلکہ ساتھی ہیں۔

اندیشے اور خدشے | شکایات کے علاوہ بعض اندیشے اور خدشے بھی ہیں۔ مثلاً بعض مسلمان کہتے ہیں کہ بے شبہ اس وقت تو
مسلمانوں کو مذہبی آزادی مکمل طور پر حاصل ہے لیکن دستور میں ایک دفعہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسٹیٹ تمام ملک میں ایک ہی
سول قانون رائج کرنے کی کوشش کرے گی[1] اگر ایسا ہوا تو مسلمانوں کے پرسنل لا کا کیا ہوگا؟ اور پھر مذہبی آزادی
کہاں رہے گی؟ جواب یہ ہے کہ اول تو پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں وزیر قانون اعلان کر چکے ہیں
کہ سول کوڈ کسی فرقہ پر زبردستی تھوپا نہیں جائے گا۔ علاوہ ازیں آپ کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ ملک کے لئے جو عام
سول کوڈ بنے گا وہ اسلامی قوانین کے خلاف ہی ہوگا، ممکن ہے وہ اسلام کے مطابق ہو جیسے ہندو کوڈ بل کی متعدد
دفعات اسلامی تعلیمات کا چربہ ہیں۔ اور پھر اگر اُس میں کوئی بات مسلم پرسنل لا کے خلاف ہوئی بھی تو آپ کو پورا
حق ہے اُس کے خلاف آواز اٹھانے اور اگر ضرورت ہو تو سپریم کورٹ کو کھٹکھٹانے کا! یاد رکھئے یہ
حق سب مسلم ممالک میں بھی نہیں ہے۔

---

(1) PART IV ARTICLE 44

بہرحال فقہانے دارالحرب کی تعریف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اور پھر ہندوستان میں دستوری طور پر مسلمانوں کو جو پوزیشن حاصل ہے ان سب کو پیش نظر رکھا جائے تو حسب ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں:-

(۱) ہندوستان چونکہ ایک سکولر جمہوری ملک ہے اس لئے یہاں کسی مذہب یا کسی مذہبی فرقہ کی حکومت نہیں ہے اس بنا پر فقہا کی اصطلاح میں "غلبۂ کفر" یہاں صادق نہیں آتا۔

(۲) شہری حقوق میں یکساں ہونے کے باعث مسلمان حکومت میں شریک ہیں۔

(۳) مذہبی آزادی کی دفعہ کے ماتحت مسلمانوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔

(۴) مسلمانوں کو معاشی۔ اور تقریر و تحریر کی آزادی بھی حاصل ہے۔

(۵) انڈین یونین کے ڈپلومیٹک تعلقات تمام اسلامی ملکوں سے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستانہ تعلقات و مراسم بھی ہیں کسی سے کم۔ کسی سے زیادہ!

(۶) انڈین یونین کی شمال مغربی سرحد مسلم ممالک سے متصل ہے۔ لاہور سے لے کر مراکو تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے۔

ان تنقیحات کی روشنی میں یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ دارالحرب ہونے کے جو شرائط ہیں اور جو ایک لفظ "استیلاء" میں جمع ہو گئے ہیں (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) اُن میں سے چونکہ کوئی ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی اس لئے ہندوستان ہرگز ہرگز دارالحرب نہیں ہے اور نہ اس جیسا کوئی اور جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو دارالحرب ہو سکتا ہے۔

یہ مسئلہ اس درجہ صاف اور واضح ہے کہ اور تو اور پاکستان کے دو نامور محقق اور فاضل اسلامیات نے بھی یہی لکھا ہے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ کے متعلق استفتا اور دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا کی طرف سے اُس کا جواب (جس کا اِن صفحات میں ذکر آ چکا ہے) پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر صغیر احمد معصومی ہندوستان اور اسی جیسی دوسری جمہوریتوں کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں:-

"دارالحرب کی جو تعریف بیان کی گئی ہے۔ نیز قرونِ اولیٰ میں دارالحرب و دارالاسلام کے جو تعلقات تھے اور جو جنگی نتائج مرتب ہوتے تھے۔ ان سب پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج کل کی سلطنتوں اور ریاستوں کو جہاں بدنظمی نہیں۔ بلکہ ایک خاص نظام

قائم ہے اور مسلمان باامن وامان رہتے ہیں۔ بلکہ اپنی تعداد کے مطابق سیاسی امور میں بھی حصہ لیتے ہیں دارالحرب قرار نہیں دیا جا سکتا۔[1]

دوسرے صاحب پروفیسر محمد شریف مرحوم ہیں جنھوں نے لکھا ہے:-

"ہندوستان کا دستور اگرچہ سکولر ہے لیکن اس میں عقیدہ، عمل اور مذہب کی جو آزادی دی گئی ہے وہ بعینہ وہ ہے جو اسلام دیتا ہے۔ اس بنا پر لفظوں کا فرق ہے — ورنہ پاکستان کی اسلامی ریاست اور ہندوستان، اسٹریلیا اور امریکہ کی سیکولر اسٹیٹ یہ سب ایک ہی ہیں۔"[2] (باقی آئندہ)

---

[1] ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (مغربی پاکستان) بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۷۱ و ۷۲۔

(2) ISLAMIC AND EDUCATIONAL STUDIES. P. 6.

(INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE, LAHORE)

حیاتِ امام اعظم ابوحنیفہؒ

اُردو زبان میں ایک اہم اور جدید کتاب

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب (مفتی بجنور) نے اس کتاب کو جدید طرز پر بڑی عرق ریزی اور محنت سے ترتیب دیا ہے —— اس کتاب کی تحقیق و ریسرچ کے سلسلہ میں متعدد اسفار بھی کئے اور امام صاحبؒ پر اُردو، فارسی، انگریزی میں اب تک جو کچھ دستیاب ہو سکتا تھا تحقیق کی روشنی میں اس سب کو خوش اسلوبی کے ساتھ اس کتاب میں سمو دیا ہے —— اُردو زبان میں امام صاحبؒ پر اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے علماء و اکابر کی رائے میں یہ کتاب علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النعمان اور ابوزہرہ کی حیات امام ابوحنیفہؒ کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

● کتابت وطباعت بہتر ● کاغذ عمدہ سفید ● سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ● ضخامت ۳۲۰ ص

قیمت مجلد ۵ روپے ۵۰ پیسے (5/50)

● ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان، اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶